مغرب کے کچھ تاریخ ساز مفکرین

چارلس ڈارون

چارلس ڈارون (۱۸۰۹ء-۱۸۸۲ء) انگریز سائنٹسٹ ہے جس کی طرف نظریۂ ارتقا (Theory of Evolution) منسوب ہے۔ ڈارون کے اس نظریے نے دراصل اس سوال سے بحث کی ہے کہ زندگی کا مبدأ کیا ہے؟ وہ کیسے وجود میں آئی؟ زمین میں جو متنوع زندہ اشیاء پائی جاتی ہیں ان کے درمیان کیا کوئی رشتہ بھی ہے؟

اس نے جو طریق مطالعہ اختیار کیا اس کا نتیجہ اس کو یہ نظر آیا کہ زمین میں جتنی زندہ اشیاء جانور وغیرہ پائے جاتے ہیں وہ دراصل ایک نسلی رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔ زندگی کا آغاز ایک خلیہ کے جسمیے (Unicellular Organism) سے ہوا تھا، وہیں سے وہ ارتقا کرتی مختلف شکلوں میں پروان چڑھتی رہی، جس سے مختلف حیوانات وجود میں آتے رہے۔ انسان بھی مخلوقات کے اسی ارتقائی سفر کا ایک پڑاؤ ہے۔ اس کے قریب ترین مورث (Apes) بندر ہیں۔

چارلس ڈارون سے پہلے بھی اٹھارویں صدی میں یورپ میں ارتقا کا نظریہ سامنے آچکا تھا۔ مشہور فرانسیسی عالم کومٹے بفن (Comte De Buffon) نے یہ خیال پیش کیا تھا۔ اس کے بعد خود چارلس ڈاروین کے دادا، راسمس (Erasmus Darwin) بھی اس نظریے کا حامل تھا۔ ڈارون کا خاص رفیق و مربی لائل (Lyell) تھا۔ تخم تو دادا ہی نے ڈالا ہوگا، مگر یہ لائل تھا جس نے اُس کے ذہن میں نظریۂ ارتقاء کی آبیاری کی۔ دراصل یورپ میں اس وقت وہ مزہب سے چڑھنے کی وہ نفسیاتی حالت پیدا ہو چکی تھی جس کی وجہ سے وہ کسی علیم وقدیر ہستی کو خالق کائنات ماننے سے منکر ہونے لگا تھا، اور اِس پُر اسرار شان دار کائنات کی گتھی، کسی ایسی طرح سلجھانا چاہتا تھا جس سے اس کارخانۂ ہستی کا خود بخود وجود میں آنا اور اپنے آپ نہایت خوبصورت نظم وترتیب سے چلتے رہنا ثابت ہو جائے۔ بس یہی نفسیاتی الجھن ہے جو ڈارون اور اس کے پیش رَووں کو ارتقا کے اِس نظریے تک لے کر گئی، اور آج تک یہی بگڑی نفسیاتی کیفیت ہے جو اس کے متبعین کو اس نظریے کا عاشق و پرستار بنائے ہوئے ہے۔

ڈارون ۱۸۳۷ء تا ۱۸۳۹ء ایک لمبے بحری سفر پر رہا۔ اس دوران اس نے مختلف براعظموں میں موجود جانوروں، پرندوں اور درختوں اور زیرزمین سے نکلنے والے متحجّر اجسام (Fossils) کے نمونے جمع کیے۔ یقیناً اس نے بڑی جانفشانی سے تحقیق کی۔ ان نمونوں کا اس نے گہرا مطالعہ کیا۔ اور خاص طور پر بعض انواع کے درمیان موجود تشابہ نیز ایک ہی نوع کے مختلف افراد کے درمیان موجود اختلاف وفرق اس کے غور کا خاص موضوع بنے۔ اگرچہ اجمالی طور پر دنیا کے تمام انسان جانتے تھے کہ بعض انواع ایک دوسرے سے ملتے ہوئے ہیں، چیونٹی اور چیونٹے کا اشتباہ بھی معلوم تھا، شیر اور بلی کی شکلوں کا اور اعضاء کا حیرت انگیز طور پر مشابہ ہونا سب کا مشاہدہ تھا۔ بھیڑ بکری ہرن بڑی حد تک ہم شکل ہیں۔ اسی طرح سب یہ بھی جانتے تھے کہ ایک ہی نوع میں بھی قدرت نے تنوع واختلاف کی عجب حیرت انگیز دنیا بسائی ہے۔ ایک ہی نوع کی قسموں میں طرح طرح کے اختلافات ہوتے ہیں۔ کتّے کی مختلف نسلوں میں جسم وقامت سے لے کر شکل وساخت تک میں، خاصا اختلاف ہوتا ہے حالانکہ وہ نہ صرف عرفاً بلکہ سائنسی طور پر اور Biologically (یعنی علم الحیات کے نقطۂ نظر سے) بھی کتّے ہی ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک یوروپین سفید فام اور افریقی نیگرو کی شکلیں اور رنگ الگ ہوتے ہیں۔ سیب کی ایک قسم کا رنگ وذائقہ دوسری قسم سے مختلف ہوتا ہے، مگر اس کے باوجود دونوں سیب ہی ہیں۔

ساری دنیا اس تشابہ کو دیکھتی اور جانتی آئی تھی، مگر ڈارون نے انواع کو ایک خاص ترتیب سے پیش کر کے دعویٰ کیا کہ اس نے جان دار اشیاء کی تخلیق کے راز کو پالیا۔ اور وہ یہ ہے کہ ان انواع کا تشابہ وتفاضل اوران کی ایک صعودی ترتیب (یعنی نیچے سے اوپر تک کا سلسلہ، کہ ایک مخلوق پائی جاتی ہے اس کے اوپر اس سے ملتا جلتا لیکن برتر اور کوئی جاندار ہے، پھر اُس کے اوپر اس سے ملتا جلتا لیکن جسمانی اعتبار سے بہتر و برتر کوئی اور جان دار پایا جاتا ہے، انواع کا باہم تشابُہ اور یہ ترتیب) یہ بتلاتی ہے کہ زمین پر جان داروں کی تخلیق اسی طور پر ہوئی ہوگی کہ خود بخود زمین کے عناصر میں موجود کیمیاوی تعامل کے نتیجے میں ایک جان دار پیدا ہوا پھر اس سے اپنے آپ کسی خود کار عمل کے نتیجے میں اور بغیر کسی صاحب قدرت وعلم خالق کی تدبیر واَمر (Intelligent Design) کے سلسلۂ زندگی چل نکلا۔

اس طرح ڈارون کا دعویٰ ہے کہ اس ارضی کرہ پر زندگی کے آغاز سے لے کر آج تک کا سفر کیسے، کن عوامل کے زیر اثر اور کن مراحل سے گزرتا ہوا آیا ہے اس نے دریافت کرلیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی کا آغاز زمین میں موجود کیمیاوی عمل کے ذریعے کبھی ایک خلیے پر مشتمل کیڑے (Unicellular Organism) سے ہوا۔ پھر اسی سے مختلف سمتوں میں ارتقا کا درخت بڑھتا رہا اور نت نئے جاندار وجود میں آتے گئے۔ اس زمین کا ماحول ہی کچھ ایسا ہے کہ ہر جاندار کی جسمانی بناوٹ میں خفیف تبدیلیاں کسی نہ کسی وجہ سے پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ ایک طویل مدت تک یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ان تبدیلیوں کے نتیجے میں ایک نیا جاندار یا نئی نوع وجود میں آجاتی ہے۔ پھر اگر یہ نئی نوع اپنی جسمانی بناوٹ کے اعتبار سے خارجی ماحول کی مشکلات سے کامیاب مقابلہ کر سکے تو وہ باقی رہتی ہے ورنہ مٹ جاتی ہے۔ ہر نوع جہد للبقا (Struggle For The Existence) پر مجبول ومجبور ہے، مگر فطرت انواع میں سے بقاءِ اصلح (Survival Of The Fittest) کے اصول کے مطابق بہتر انواع کو چن لیتی ہے، جس کو ڈارون نے فطری انتخاب (Natural Selection) کا اصطلاحی نام دیا۔

ڈارون نے اپنے اس نظریے کے حق میں اپنے نزدیک جو سب سے مضبوط دلیل دی ہے وہ یہ واقعہ ہے کہ طبقات الارض (Geology) کی تحقیقات بتاتی ہیں کہ زمین کے نچلے طبقات سے جن جانداروں کا پتہ چلا ہے وہ نچلے درجے کے تھے جب کہ اوپر کے طبقات میں ان سے بہتر اور اونچے درجے کے اجسام ملے۔ مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ اعلیٰ اجسام انہی ادنیٰ اجسام سے ارتقا کے ذریعے وجود میں آئے تھے، یہ کیوں نہیں مانا جاسکتا کہ پہلے زمانے میں خالق نے جن حیوانات کو پیدا کیا تھا بعد کے زمانے میں اس کی حکمت کا تقاضا ہوا کہ وہ اپنی قدرت سے اس سے بہتر مخلوق پیدا فرمائے۔

مغرب کے تمام علم وفکر کا نقطۂ آغاز خدا کو نہ ماننے کی چھپی خواہش ہے، جو کسی ٹھوس علمی استدلال یا خالص سائنسی دلیل پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے پیچھے ایک بگڑا ہوا رجحان نفس ہے۔ یہ ارتقاء کی تھیوری بھی در اصل اسی بگڑی نفسیات پر مبنی ہے۔ اس میں جتنا حصہ ٹھوس تجرباتی مشاہدے (Scientific Observation) یا قابل تجربہ سائنسی ثبوتوں (Emperical Evidence) پر مشتمل ہے وہ صرف اتنا ہے کہ جان دار انواع میں تشابہ بھی پایا جاتا ہے اور تفاضل بھی۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے بعض جان دار کنہی خاص مگر نامعلوم وجوہات سے صفحۂ ہستی سے مٹ جاتے ہیں۔ خود ایک ہی نوع کے اندر بھی جسمانی بناوٹ اور شکل وشباہت کا فرق پایا جاتا ہے اور یہ معلوم نہیں کہ ان کا سبب کیا ہے۔

اس کے علاوہ اس تھیوری میں جو کچھ ہے وہ صرف ذہنی اڑان اور قیاسی پرواز ہے۔ اس میں کچھ سائنٹفک نہیں۔ ڈارون نے مختلف انواع اور ان کے تشابہ کی ایک قیاسی وجہ اور سبب ایک خود کار ارتقاء مانا ہے۔ اس ارتقاء کا کوئی حقیقی مشاہدہ اس نے اور اس کے متبعین نے نہیں کیا ہے۔ آج تک بین الانواع ارتقاء وانتقال (Transitional Species) کا کوئی متفق علیہ ثبوت نہیں ملا ہے۔

ارتقاء کے حامی جن بہت سی انواع کے متحجر نمونے (Fossils) اس دعوے کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ یہ فلاں اور فلاں انواع کے بیچ کی مخلوق تھی، ان کے دعوے کی بنیاد اعضاء اور شکل کے تشابہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ان متشابہ لیکن مختلف انواع کو الگ الگ مخلوق اور مستقل نوع ماننے میں کیا رکاوٹ ہے؟ اگر بکری، ہرن اور بھیڑ، اپنی تمام مشابہتوں کے باوجود، الگ الگ انواع ہیں تو یہ (Fossils) الگ انواع کیوں نہیں ہو

سکتے ؟ اوراعضاء کی شباہت کی بنا پر یہ دھوکہ کیوں کھایا جائے کہ یہ اپنے آپ ارتقاء کے ذریعے تشکیل پانے والی نوعیں تھیں؟ تعجب ہے اس عقل پر جو اس نہایت معقول اور ظاہر سی بات کو نہ قبول کرے اور اس کے بجائے آسمان میں اٹکل پچو تیر چلائے۔

اگر مذہب اور ہمیشہ سے انسان یہ کہتے آئے ہیں کہ اشیاء وانواع ایک بے پایاں علم وقدرت اور غیر معمولی حکمت والے خالق کا شاہ کار ہیں، یہ وہی خالق وصاحب تدبیر ہے جس نے انواع میں تشابہ وتفاضل رکھا ہے، انواع واقسام کو اس نے ملتا جلتا'' **متشابهاً وغير متشابه** ''پیدا کیا ہے۔ پھر کچھ انواع کو اس نے پہلے پیدا کیا اور ایک زمانے تک پیدا کرتا رہا، پھر اپنی حکمت کے تحت ان کو ختم کردیا، کچھ کو لگاتار پیدا کیے جارہا ہے اور کچھ نئی انواع کو بعد کے زمانے میں پیدا کرنا شروع کیا، اگر مذہب اور ہمیشہ سے انسان یہ کہتے آئے ہیں تو نظریۂ ارتقاء کے پاس اس کے بطلان کی کوئی سائنسی دلیل نہیں ہے۔

ارتقاء کے اس بے بنیاد نظریے کے خلاف جو سب سے مضبوط دلیل ہے کہ اگر حیوانات کے درمیان ارتقاء کوئی حقیقت ہے تو وہ اب کیوں جاری نہیں۔ گوریلا اور چمپانزی جیسے بندر کی جس شکل کو یہ محرومان عقل وبصیرت انسان کا قریب ترین مورث (Descent) مانتے ہیں اس کے اور انسان کے درمیان کی کڑیاں کہاں ہیں؟؟ اور کیوں ایسا نہیں ہے کہ ہمیں جنگلوں میں کچھ ایسے گوریلے مل جائیں جو گوریلا سے انسان کے درمیان کے مرحلے میں ہوں، اور لگاتار''انسانیت'' کی طرف بڑھ رہے ہوں؟ یہ آپ کی عجب لاجواب منطق ہے! ایک طرف ارشاد ہے کہ ارتقا ناقابل تردید سائنٹفک حقیقت ہے، اور دوسری طرف یہ عالم ہے کہ بیچ کی کڑیوں کا کوئی ثبوت سوائے عالمِ خیال کے کہیں نہیں ہے!!

امریکی ریاست اوہیو یونیورسٹی کے پروفیسر والٹر اسٹارکی نے اس موضوع پر ایک عام فہم دلچسپ کتاب لکھی ہے۔ اس میں وہ لکھتا ہے کہ نظریۂ ارتقا کے حامی کہتے ہیں کہ ارتقا ایک سست رفتار تدریجی عمل تھا۔ اس کا بدیہی تقاضا تو یہ ہے کہ ہمارے سامنے بے شمار تعداد میں ایسے (Fossils) ہوتے جو اپنے انتقالی مرحلے میں ہوتے۔ ابھی ان کے نئے اعضا ۲۵ فیصد ۵۰ یا ۷۵ فیصد پائے جاتے۔ مگر ہمیں ہر قسم کے فاسل میں مکمل اعضا ہی ملتے ہیں۔ دنیا کے مختلف میوزموں میں اس وقت دس کروڑ فاسل ہیں ان میں ایک بھی ایسا نہیں ملتا جس کے اعضا ابھی تشکیلی مرحلے میں ہوں اور وہ ادھ بنے اعضا کا جانور ہو۔

> Inspite of the fact that there are about 100.000.000 fossils in various meuseums and laborateries of the world, the fossil record provides no evidence of the existence of any partially completed featur.(Evolution Exposed By Walter. S. Starkey. P: 48 Columbus, Ohio 2011)

وہ مزید کہتا ہے کہ ارتقائی نظریے کے مطابق لافقاری (Invertebrates) جانوروں میں ارتقائی تبدیلی کے نتیجے میں ریڑھ کی ہڈی پیدا ہونے لگی یہاں تک کہ مچھلی کی صنف بنی، تو ہمیں ایسے فاسل نمونے کیوں نہیں ملتے جس میں کسی مچھلی کے پچیس فیصد ریڑھ کی ہڈی بنی ہو؟ کسی میں پچاس فیصد ریڑھ کی ہڈی بنی ہو؟ وہ یہی بات برمائی جانوروں (Amphibians) سے زاحفات (Reptiles) کے ارتقا کے مفروضے کے بارے میں کہتا ہے۔

خود ڈارون کو اس مشکل کا احساس تھا۔ درمیانی کڑیوں کے فقدان کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ:

This perhaps is the most obvious and gravest objection which can be urged against my theory."

شاید یہی میرے نظریے کے خلاف قائم ہونے والا سب سے واضح اور طاقت ور اعتراض ہے۔

(On The Origin of Species, p: 269 Broadweive press, Canada)

اس عالم کائنات کے کسی خدا کی تخلیق ہونے کے خلاف سائنس کی دنیا میں جو موقف اختیار کیا گیا ہے اس کی ایک بڑی بنیادی نظریۂ ارتقا ہے۔ خود ڈارون بے چارہ اپنے ارتقائی نظریہ کو''نظریہ'' ہی کہتا رہا۔ یہاں تک کہ نظریۂ ارتقاء کے پرزور وکیل بھی اس اعتراف پر مجبور رہے ہیں، اور آج بھی ہیں کہ انواع کا ارتقاء ٹھیٹ سائنسی معیار کے مطابق حقیقت (Fact) نہیں نظریہ (Theory) ہے۔ فزہف Kirk J. Fitzhugh علم حیاتیات کا معروف سائنٹسٹ اور ارتقا کا طاقت ور حامی ہے، اس نے لکھا ہے کہ ارتقا کو ٹھیٹ سائنسی اصولوں کے مطابق صرف سائنسی حقیقت (Scientific Fact) نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اس میں نظریے اور قیاس کی کافی آمیزش ہے۔

https://en.wikipedia.org/w/index.php?title=Evolution_as_fact_and_theory&action=edit§ion=9" \o "Edit section: Evolution as a collection of theories not fact

مگر جس کو سائنس کی اڑتی ہوا بھی لگ گئی ہے، وہ ایسے زور وشور سے اس کا راگ الاپتا ہے جیسے ارتقا تمام شک شبہے سے بالاتر سائنسی حقیقت ہے۔ جب کہ سائنس کی دنیا کے محققین آج بھی نظریۂ ارتقا کو تذبذب کی زنجیروں سے آزاد نہیں کرا پائے ہیں۔

ڈارون نے اپنے اس مطالعے کا آغاز ۱۸۳۷ء تا ۱۸۳۹ء کے اپنے مذکورہ سفر سے کیا۔ مگر اس کو ایک باقاعدہ (On The Origin Of The Species) نامی کتاب کی شکل میں ۱۸۵۹ء میں پیش کیا۔ کتاب کا آنا تھا کہ الحاد پسند دانشوران مغرب کو نعمت غیر مترقبہ مل گئی۔ وہ ذہن جو زمانے سے مذہب دشمنی کی نفسیات میں مبتلا اور اپنی اسی مخصوص تاریخ کے ردعمل میں بری طرح گرفتار تھا، جس کا تذکرہ پہلی فصل میں آچکا ہے، اس کو اپنے الحاد کے لیے ایک ''دلیل'' بھی مل گئی۔ یہ مغرب کی ایک گہری نفسیاتی گرہ ہے۔ مذہب دشمنی اور خدا بیزاری کے خیالات کے تار و پود جو چیز بکھیرتی رہتی ہے وہ خدا کی پیدا کردہ کائنات کا ایک ایک ذرہ اور اس کے بنائے ہوئے حیوانات کا ایک ایک فرد ہے، جو اپنے علیم وقدیر اور حکیم و مدبر خالق کی گواہی دیتا ہے۔

جدید مغرب کی یہی مجبوری اور کمزوری تھی کہ وہ خالق کائنات کی ان آیات سے آنکھیں چراتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی طرح اس کو کسی خالق و مالک اور معطی ومنعم کا اقرار نہ کرنا پڑے۔ اس لیے کہ یہ اقرار انسان کو لامحالہ دین ومذہب اور اللہ کی عبودیت واطاعت تک لے جاتا ہے۔ ڈارون کے نظریے کی شکل میں اس کو خالق کائنات کے اقرار سے بھاگنے کا بہانہ بھی مل گیا۔ اس طرح الحاد کی جس گاڑی کو مغرب بے پہیّوں کے دھکیل دھکیل کر چلا رہا تھا اس کو ڈارون نے نظریۂ ارتقا کے پہیّے دے دیے۔

حد تو یہ ہے کہ خدا و مذہب کے انکار کے لیے مغرب نے نظریۂ ارتقا کو جس شدت کے ساتھ استعمال کیا خود ڈارون کے یہاں نہ وہ شدت ہے نہ خالق کائنات کے انکار پر یقین۔ اس کی حالت کا حاصل یہ ہے کہ وہ بے چارہ ہدایت سے محروم تھا، اس کے سامنے حق اپنی کھری شکل میں سامنے نہیں آیا تھا۔ چرچ کی عیسائیت کے بگاڑ نے اس کو شکوک وشبہات کے صحرا میں بھٹکتا چھوڑ دیا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ سائنسی تحقیق نے مذہب کے مقدمے کو صراحۃً غلط بھی ثابت نہیں کیا تھا۔ اس نے کبھی یہ نہیں کہا کہ کائنات یا حیوانات کی تخلیق بغیر کسی خدا کے ہوگئی، زیادہ سے زیادہ وہ جس حد تک پہنچا تھا اس کو وہ شک وارتیاب سے زیادہ نام نہیں دیتا تھا۔ اس کے بیٹے فرانسس ڈارون نے اس کی خود نوشت اور کچھ خطوط شائع کیے۔ اس میں وہ لکھتا ہے کہ میرے والد مذہب کے بارے میں متردد اور متذبذب تھے۔ اس نے اپنے والد چارلس ڈارون کا ایک خط نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی کتاب اصل الانواع کی تالیف کے کافی عرصے بعد بھی، یعنی ۱۸۷۹ء میں، وہ اپنی حالت کو الحاد نہیں کہتا تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ ''مذہب کے بارے میں میری ذہنی کیفیت بڑی سخت ڈانوا ڈول رہی ہے۔ اس کے بیان کے لیے جو الفاظ زیادہ موزوں ہیں وہ خدا کے بارے میں شک وارتیاب (Agnosticism) ہیں''۔

Autobiography and Selected Letters

By Charles Darwin, Francis Darwin p: 59

Newyork, Googlebooks

مگر پیراں نمی پرند مریداں می پرانند کے مصداق، مغرب پر اور اب اس کے بے بصیرت چیلوں پر الحاد ایسا سوار ہے کہ جس نے چار حرف پڑھ لیے وہ سائنس کا نام لے لے کر دین ومذہب کو وہم وخیال بتاتا ہے اور خم ٹھونک ٹھونک کر دعویٰ کرتا ہے کہ ڈارون نے کسی علیم وقدیر ہستی کے ذریعے تخلیق کائنات کے تصور کو نیست ونابود کر دیا۔ جب کہ وہ بے چارہ خود اپنے کو تذبذب کا شکار اور شک کے عالم میں بتاتا تھا۔ مگر یہ جاہل ایسے جری وباغی ہو چکے ہیں اور شیطان ان پر ایسا مسلط ہے کہ کچھ مجنون ڈارون کے بارے میں یہ تک دعویٰ کرتے ہیں کہ ''....... The man who killed The'' **تعالیٰ اللہ عما یقول الظالمون علوا کبیرا۔**

اٹھارویں صدی سے ہی مغرب کو الحاد و مادیت سے عشق وشغف تھا۔ اس حال میں ڈارون کا نظریہ غیر معمولی طور پر مقبول عام ہوا۔ مغربی فکر کی

تشکیل میں ڈارون کے اس نظریے کا تاریخی کردار ہے۔ پریس کی ایجاد نے عوامی انتشار و مقبولیت کے خوب موقعے فراہم کیے۔ اخبارات نے بھی خوب شہرت دی۔ طبیعیات، علم الحیات یہاں تک کہ تاریخ و جغرافیہ تک کی نصابی کتابوں میں اس کو شامل کیا گیا۔ پھر اس نے عام تعلیم یافتہ طبقے کے ذہن کا سانچہ ایسا بنا دیا کہ اس میں روحانیت و مذہب اوہام و خرافات سے زیادہ کچھ مقام حاصل کرنے کے قابل نہیں بچے۔ پروپیگنڈے کے زور سے دل و دماغ کی گہرائیوں میں یہ بات بٹھا دی گئی کہ انسان حیوان محض اور بندروں کی اولاد ہے۔ انسان کی تمام سرگرمیاں سیاست و تمدن سے لے کر مذہب و اخلاق تک سب کچھ اس کی حیوانی اصل ہی کی پیداوار ہیں۔ اس طرح ایک عام پڑھا لکھا آدمی اس مغالطے کا شکار ہے کہ نظریۂ ارتقا ایک ثابت شدہ نا قابل انکار سائنسی حقیقت ہے۔ اس فکر و خیال کا جو اثر نفسیات و اخلاق پر پڑنا چاہیے اس کا اندازہ کچھ مشکل نہیں، اور جدید دنیا اس کا نمونہ بنتی جا رہی ہے۔

الحاد پسندی کے ان ذہنی مریضوں کے لیے یہ نظریہ صرف خدا کے انکار کے لیے ہی کارآمد نہیں تھا، بلکہ مغرب نے اس کو لے کر مذہب و اخلاق کی ان تمام تعمیروں کو منہدم کرنا شروع کر دیا جو ماضی کے اس دور کی یادگار تھیں جب مذہب انسانی زندگی کا رہنما ہوا کرتا تھا۔ خدا کی عطا کردہ فطرت کی سلامتی اور انبیاء و رسل کی تعلیمات کو جو کچھ باقی ماندہ سرمایہ انسانیت کے پاس باقی تھا نظریۂ ارتقا کی کلہاڑیاں اس کی بنیادوں پر تیشہ چلانے کے لیے کافی تھیں۔ جب انسان کوئی شریف و عالی مخلوق نہیں محض بندر کی ایک ارتقائی شکل ہے، اور ہاتھی، شیر، کتے اور سور اس کے بنو اعمام ہیں تو کہاں کا مذہب و اخلاق اور کہاں کی روحانیت و شرافت؟ اور پھر اس کے لیے خیر و شر کے کیا معنیٰ؟ اور خدا پرستی و پرہیزگاری کی کیا گنجائش؟ اور پھر حلال و حرام کے تصورات بھی بایں طور ارتقائی قرار پائے کہ یہ سب انسانی نوع کے کسی خاص دور اور ذہن کے تراشیدہ خیالات ہیں۔ ارتقاء کا ''ثابت'' ہونا تھا کہ یہ طے ہو گیا کہ نہ کوئی عمل خیر ہوتا ہے نہ شر، نہ عقیدہ مستقل نہ اصول و اخلاق متعین، زمانے کے ساتھ سب بدلتا رہتا ہے اور ہر چیز میں ارتقا و تغیر ہے۔

ثبات بس اک تغیر کو ہے زمانے میں

اب معاشرے کو بگاڑ کی جس وادی میں بھی لے جایئے اور فساد کے جس سمندر میں بھی غرق کیجیے، ہر چیز کے جواز و قبول کے لیے یہی ارتقائی نظریہ کام دینے کے لیے کافی ہے۔ اور غلاظت کے ہر اخلاق اور خباثت کے ہر عمل کو سائنس پرستی اور تجدّد کے فخر کے ساتھ اختیار کیا جا سکتا ہے۔

سگمنڈ فرائڈ

Sigmond Frued

فرائڈ کا نظریہ انسانی نفسیات سے متعلق ہے، اور جدید دور کے اہم نظریات میں شمار ہوتا ہے۔ مغرب کی تہذیب وفکر کا اندازہ کرنے کے لیے وہ ایک اہم معیار بن سکتا ہے۔ انسانیت کے بارے میں فرائڈ کا نظریہ جتنا خبیث ہے اتنا ہی عجیب وغریب بھی۔ مشکل سے یقین آتا ہے کہ ایسی باتیں بھی کوئی انسان کرسکتا ہے۔ اور مزید حیرت کہ ''مفکرین واہل دانش'' کی بے شمار تعداد اس کو انسانی نفسیات کا عظیم راز داں، رمز کشا اور بڑا عالم بھی مانتی ہے۔ مغربی فکر میں عموماً انسانی نفسیات کی معرفت وتحقیق میں فرائڈ کو امامت کا جو مقام دیا جاتا ہے اس میں کوئی دوسرا اس کا ہم سر نہیں۔

کفر وجاہلیت کی مغربی امامت وقیادت کے اس دور سے پہلے انسان تمام جاہلیتوں اور کفر وشرک کے باوجود ہر دور میں اس کا قائل ومعترف رہا ہے کہ نوع انسانی ایک شریف وپاک مخلوق اور اعلیٰ فطرت کی حامل نوع ہے۔ اس کی نفسیات میں خیر پسندی وحق پرستی کے عوامل موجود ہیں۔ وہ اچھا بننا چاہتا ہے۔ اعلیٰ اخلاقیات کی طرف فطری میلان رکھتا ہے۔ برائیوں گندگیوں اور ظلم وحق تلفی سے اس کی فطرت ابا کرتی ہے۔ اس کے اندر اس کا داخلی رجحان ہے کہ وہ انصاف قائم کرے، مظلوم کی دادرسی کرے، کمزور کی مدد کرے، بھوکے کو کھانا کھلائے اور مخلوق خدا کی ہمدردی وغم خواری کرے۔ یہ اس کی فطرت کے ذاتی میلانات ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے اندر لالچ، حرص، انانیت، خودغرضی اور حسد جیسے برے نفسانی جذبات بھی ہیں۔ مگر ان چیزوں میں مبتلا ہونے کے باوجود عموماً انسان ان کو برا ہی سمجھتا ہے۔

اگر کوئی فرد یا طبقہ انسانیت کی اس بلند سطح تک اپنے فکر وشعور کو پہنچانے سے قاصر بھی ہوتا ہے تب بھی فطرت انسانی کے یہ اوصاف ہمیشہ معروف ومسلّم رہے ہیں کہ انسان ایک متمدن مخلوق ہے، اجتماعیت پسند ہے، اس کے اندر ایک جمالیاتی ذوق ہے۔ اور یہی چیزیں اس کو ایک الگ مخلوق بناتی ہیں، اور ان ہی کی وجہ سے وہ اخلاقی، سیاسی، ادبی اور دیگر اعلیٰ انسانی سرگرمیاں انجام دیتا ہے۔

ہر دور میں اور ہر قوم میں فطرت انسانی کے یہ حقائق تسلیم شدہ رہے ہیں۔ مگر مغرب کے حصے میں جیسا ضلال آیا ہے، اور انسانیت کو پستی وننگ میں مبتلا کرنے کا جو کردار اس کے لیے مقدر ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ انسانی شرافت وپاکیزگی کا ہر احساس دل ودماغ سے مٹا دیا جائے۔ ڈارون کے نظریۂ ارتقا کے ذریعے انسان کو حیوان محض اور کتے اور بندر کی سطح پر پہنچا کر بھی شیاطین مغرب کو تسکین نہیں ملی۔ ان کو انسانیت کو پست وحقیر ہی نہیں بنانا تھا، غلیظ وخبیث بھی قرار دینا تھا۔ اور یہ کام سگمنڈ فرائڈ نے اس طرح انجام دیا کہ اس نے فطرت انسانی کا بنیادی قوام غلاظت وناپاکی قرار دیا۔ اس نے بتایا کہ انسانی فطرت میں پاکی وخوبی کے جتنے احساسات بتائے جاتے ہیں وہ سب اصل حقیقت کو چھپانے کی جھوٹ پر مبنی کوششیں ہیں۔ انسان کی اصل یہ ہے کہ وہ سراپا گندگی ہے۔ اس کی فطرت کی حقیقت اور اس کی نفسیات کی اصل صرف اور صرف جنسی خواہش ہے۔ وہ ماں کی گود سے قبر تک اسی کے لیے جیتا اور مرتا ہے۔ اس جنسی خواہش کے علاوہ اس کی تمام سرگرمیاں دھوکہ دہی اور فریب ہیں۔

سگمنڈ فرائڈ (۱۸۵۶ء، ۱۹۳۸ء) آسٹریا کا ایک طبیب تھا۔ اس کو نفسیاتی امراض سے دلچسپی پیدا ہوئی جس کے نتیجے میں اس نے نفسیاتی امراض کا مطب شروع کیا۔ کچھ دنوں کے بعد اس نے دعویٰ کیا کہ اپنے مریضوں کے حالات کے مطالعے کے ذریعے اس نے نفس انسانی کی حقیقت وماہیت سے متعلق ایک نیا انکشاف کیا ہے۔ اس نے نفس انسانی سے متعلق اپنا نظریہ مختلف کتابوں میں پیش کیا ہے، جن میں The Ego And The Id سب سے مشہور ہے۔

لاشعور Sub-conscious:

فرائڈ کہتا ہے کہ انسانی نفس کا ایک حصہ تو وہ ہے جسے ہم محسوس کرتے ہیں اور شعور (Concious Self) کہتے ہیں۔ جہاں مختلف جذبات واحساسات اور خواہشات کا ہمیں ادراک ہوتا ہے۔ اور جس کی مدد سے ہم سوچتے، جانتے اور گردوپیش کے حالات کو محسوس کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اس شعور کے علاوہ نفس انسانی کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو ہمارے شعور کی سطح کے نیچے موجود رہتا ہے۔ فرائڈ اس کو تحت الشعور (Sub-conscious) یا لاشعور (Unconscious) کہتا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق نفس انسانی کا اصل اور بڑا حصہ یہی لاشعور یا تحت الشعور ہے۔ یہی انسانی خواہشات وخیالات کا اصل مرکز ومنبع ہے۔ بلکہ اس کے نزدیک انسان کی اصل شخصیت اور اس کا اصل ''نفس'' یہی لاشعور ہے۔ ہمارے تمام خیالات وجذبات، تمام میلانات ورجحانات اور اور تمام اوامر ونواہی اسی لاشعور کی دنیا سے آتے ہیں۔

فرائڈ کا دعویٰ ہے کہ لاشعور کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک زبردست جنسی خواہش ہے، جسے ہر مرد وعورت کا نفس لامتناہی حد تک پورا کرنا چاہتا ہے۔ یہ خواہش لاشعور کی سطح پر ایک زبردست طوفان کی طرح موج زن رہتی ہے۔ لاشعور اس خواہش کو شعور کے حوالے کرتا ہے کہ وہ اس کی تکمیل وآسودگی کا انتظام وتدبیر کرے۔ مگر شعور کے سامنے خارجی مشکلات ہوتی ہیں، جن کی وجہ سے وہ لاشعور کے اس مطالبے کی پورے طور پر تکمیل کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ یہ خارجی مشکلات دراصل سماج کی کھڑی کی ہوئی وہ رکاوٹیں ہیں جو کسی انسان کو پوری آزادی سے جنسی خواہش کی تکمیل نہیں کرنے دیتیں۔ افراد مجبور ہوتے ہیں کہ وہ سماج میں اپنی نیک نامی باقی رکھنے کے لیے اپنے لاشعور کے اس مطالبے کی تکمیل نہ کریں۔ وہ کہتا ہے کہ طوفان بلا خیز جیسی ان جنسی خواہشات کو روکنے کی وجہ سے انسان کو بے قراری اور بے چینی لاحق ہوتی ہے اور اس کا دماغی توازن بگڑنے لگتا ہے۔

فوق الشعور Super Ego:

فرائڈ کہتا ہے کہ انسان کے لاشعور میں جو جنسی خواہش ایک طوفان تمنا کی طرح موج زن ہوتی ہے اس کو روکنے کے لیے انسان کے اندر ایک فوق الشعور پیدا ہو جاتا ہے جو انسان کے شعور پر آدرشوں (Ideals) کو پیش کرتا ہے اور شعور کو ان کے حصول کی ترغیب دیتا ہے۔ یہ آدرش وہ ڈھکوسلے ہیں جو نفس انسانی کو بہلانے کے لیے سماج نے بنا رکھے ہیں۔ تاکہ اُس کی فطری خواہش سے روکا بھی جا سکے اور اس کی بےچینیوں کو کچھ قرار بھی آ سکے۔ سماج کے بنائے ہوئے یہ ڈھکوسلے ہیں: مذہب، اخلاق، ہنر، علم، سیاست، جمالیاتی ذوق، ادب وشعر جیسی مصروفیات جن کو انسان اپنا مقصد یا آدرش (Ideal) بنا لیتا ہے۔ یعنی سوائے جنسی عمل کے انسان کی ہر سرگرمی دراصل اس کو بے وقوف بنانے اور بہلانے کا ذریعہ ہیں۔ ان میں حقیقت اور واقعے کا کوئی ذرہ نہیں ہے۔ ان کی حقیقت صرف دھوکے اور لبھاؤ نے فریب کی ہے۔ ان چیزوں کی ایجاد انسان کی اصل فطری خواہش کا گلا گھونٹنے کے لیے عمل میں آئی ہے۔

خباثت کی انتہا:

فرائڈ چوں کہ یہ کہتا ہے کہ جنسی خواہش ہی فطرت انسانی کی کُل اصل ہے، اس لیے ضروری تھا کہ بچپن میں بھی ہم کو اس فطرت کا ظہور کہیں محسوس ہوتا، جب کہ جنسی عمل جوانی میں پیدا ہوتا ہے۔ اس اعتراض کو رفع کرنے کے لیے مغرب کے اس ''محقق اعظم'' نے یہ تحقیق انیق پیش کی کہ بچے کا اپنا انگوٹھا چوسنا یا ماں کا دودھ پینا یہاں تک کہ بول وبراز کرنا اس کے جنسی افعال ہیں جن سے اس کو جنسی لذت حاصل ہوتی ہے۔ اور پھر بچہ جب بڑا ہونا شروع ہوتا ہے تو اگر وہ لڑکی ہو تو اپنے باپ سے اور اگر لڑکا ہو تو اپنی ماں سے اس کو ایک جنسی نوعیت کی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس جنسی محبت کی وجہ سے لڑکے کے دل میں باپ کے خلاف اور لڑکی کے دل میں ماں کے خلاف رقابت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس رقابت کو اس نے (Oedipus Complex) آبائی الجھاؤ کا نام دیا ہے (حاشیہ: اوڈیپس یونانی دیومالا کا ایک کردار ہے۔ اس بادشاہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے باپ کو قتل کرکے اپنی ماں سے شادی کر لی تھی۔ اردو میں اس کا ترجمہ لوگ آبائی الجھاؤ کرتے ہیں جو اس کے اصل پس منظر کو نہیں بتاتا)۔ اور یہیں سے اس کے اندر نفسیاتی پیچیدگیوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

مختصراً آپ کہہ سکتے ہیں کہ فرائڈ کے فلسفے کا حاصل یہ ہے کہ انسان ایک خالص شہوانی مخلوق ہے۔ چوں کہ فطرت انسانی کی اصل صرف جنس اور شہوانیت کی ہر وقت بھڑکتی آگ ہے، جس کو بجھانے کی کوئی سبیل ایک فرد نہیں پاتا اس لیے سماج اور خود انسان کے ''فوق الشعور'' (Super Ego) نے انسان کو بہلانے کے لیے خدا پرستی، خیر پسندی، نیکی، محبت، ایثار اور جمالیاتی حس اور ان جیسے دوسرے بہلاوے ایجاد کر لیے ہیں۔ ورنہ انسان کی فطرت میں ان جیسی کوئی چیز حقیقۃً نہیں پائی جاتی، اور نہ ان چیزوں سے اس کی ذات کی کسی قسم کی تکمیل یا فطرت کی آسودگی کا تعلق ہے۔ یہ سب سماج کے ڈھکوسلے اور فریب ہیں۔

فرائڈ کی تشریح کے مطابق ایک انسان کے لیے مندرجہ ذیل تین ہی راستے ہوتے ہیں:

(۱) وہ اپنے لاشعور کی حد درجے ناپاک اور خبیث اور بے تحاشا جنسی خواہش کو پورا کرتا پھرے۔ بے شک سماج اس کو برا کہے گا مگر وہ اپنی فطرت کے مطابق کام کر رہا ہوگا۔

(۲) یا وہ سماج کی رکاوٹوں کے سامنے اپنی فطرت کی طلب کا گلا گھونٹ دے، مگر ایسی صورت میں ہسٹریا اور جنون وغیرہ نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہو جائے گا۔

(۳) یا وہ اپنی اصل پیاس اور طلب کو دبا کر مذہب، اخلاق، ہنر، سیاست اور علم وغیرہ جیسی سرگرمیوں سے اپنے آپ کو بہلاتا رہے۔ مگر فرائڈ بتاتا ہے کہ یہ تمام چیزیں اپنا کوئی حقیقی وجود اور انسانی فطرت اور نفس میں اپنی کوئی حقیقی افادیت نہیں رکھتیں، یہ سب صرف انسان کے دکھے دل کو مبتلائے فریب رکھنے اور اس کی محروم تمنا نفس کی تسلی کے سامان ہیں۔

فرائڈ کی مقبولیت اور ''اہمیت''

اگر اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ کر یہ سب کتابوں میں نہ پڑھا ہوتا تو کسی طرح یقین نہیں آ سکتا تھا کہ کوئی انسان ایسی خبیثانہ ہفوات بھی بک سکتا ہے۔ مگر تاریخ انسانی کا المناک طرفہ یہ بھی ہے کہ اس مسخ فطرت کے حامل پلید و مجنون شخص کو جدید جاہلیت میں نفس انسانی کے مخفی رازوں کا انکشاف کرنے والے محقق کبیر کا مقام دیا گیا ہے۔ مغربی نفسیات کی وہی الحاد پسندی یہاں بھی اس کی شقاوت و بے توفیقی کا سبب بنی۔ اس کا نظریہ نفسیات کے اہم ترین نظریات میں شمار ہوتا ہے۔ اس پر ہزاروں (بلا مبالغہ ہزاروں) کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اور آج بھی بڑے بڑے ڈاکٹر اور پروفیسر اس کی ''تحقیقات'' پر سر دھن رہے ہیں۔ یونیورسٹیز اور کالجز میں فرائڈ اور اس کا Psycho Analysis (تحلیل نفسی) پر مشتمل یہ نظریہ علم نفسیات کے نصاب کا جز ہے۔

جدید مغرب کی تشکیل میں فرائڈ کا کردار:

انسانیت کی اس قدر تذلیل اور اس کو اس قدر رکمینہ فطرت، ناپاک، خبیث اور شریر بتانے کے بعد انسان کو ابلیس کو بھی شرما دینے والا شیطان بنانے میں کس چیز کی کمی رہ جاتی ہے؟ مغرب کے ان مقبول عام نظریات سے ویسی ہی دنیا بن سکتی ہے جیسی اس وقت بن رہی ہے۔ کسی انسان کو اچھا بنانے، اس میں خیر و فضیلت، نیکی و پاکی، ہمت و کردار اور بلند فکری و عزیمت کی صفات پیدا کرنے کے لیے یا سچے مذہبی خیالات مہمیز کا کام کر سکتے ہیں یا انسانیت کی شرافت و عظمت کا احساس اس کی بنیاد بن سکتا ہے۔ یورپ کے ان جدید مفکرین نے انسانیت کو اس کی ان دونوں سب سے قیمتی متاع سے محروم کر دیا۔ واقعۃً اور بلا کسی تعصب و نفرت کے کہا جا سکتا ہے کہ یہ مفکرین انسانیت کے سب سے بڑے قزاق ہیں جنھوں نے انسانیت سے اس کا سب سے قیمتی جوہر یعنی نوع انسانی کی شرافت و بلندی کا احساس اس سے چھین لیا اور اس کو بتایا کہ وہ ایک حقیر و ذلیل حیوان کے علاوہ کچھ نہیں۔

مگر قزاقوں کی اس جماعت میں فرائڈ کے لیے امامت کا جو مقام ہے اس میں اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔ اس نے انسانیت کو جس ننگ و ذلت سے داغ دار کیا اس کا کوئی تصور بھی یقیناً مغربی جاہلیت سے پہلے کبھی کسی کمین فطرت مخلوق کے ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ جب پورے کے پورے معاشروں کو

شیاطین ایسے قبیح فلسفے پڑھائیں گے، دانش گاہوں اور فکر وخیال کے مراکز میں ایسے خبیث افکار کی نشر واشاعت کی جائے گی، جاہلیت کی بین الاقوامی کانفرنسوں میں اس مفکر کی شان میں قصائد پڑھ پڑھ کر بتایا جائے گا کہ فطرت انسانی کے سمندر میں ایسی غوّاصی ودرّا کی کسی کے حصے میں نہیں آئی اور وہ انسانی فطرت کی حقیقت کا مکتشف اعظم ہے،تو پھر فساد آدمیت کا جو بھی منظر نظر آئے وہ کم ہے۔

کسی کواس میں کچھ شبہ ہوتو بے حیائیوں کے اس طلاطم خیز سمندر پر نظر کر لے جس میں مغربی دنیا غرق ہے۔ بے حیائی بلکہ زنا کی اس تہذیب کی پیداوار میں ان گمراہ فلسفیوں کو بڑا دخل ہے جنہوں نے انسانی تہذیب کی عمارت سراسر حیوانیت اور مادیت پر کھڑی کرنی چاہی۔ ڈارون،فرائڈ اور مارکس جیسے جاہلیت کے ان اماموں نے انسان کو جب حیوان محض ہی سمجھا تو پھر ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ اخلاق وتمدن اور عمرانیات تک میں ان جاہلانہ فلسفوں کو بنیاد بنا لیا گیا۔ اور انسان اپنے نفس وضمیر اور معاشرت ومعاملات کی رہنمائی کسی خدائی یا الہامی یا برتر ماخذ ہدایت میں تلاش کرنے کے بجائے جانوروں کی زندگی میں تلاش کرر ہاہے اور پورے فخر کے ساتھ اپنے آپ کوایک جانور سمجھنے اور سمجھانے پر تلا ہوا ہے۔

کارل مارکس

Karl Marx (1818-1883)

جدید مغرب کے فلسفیوں میں کارل مارکس کا ایک خاص مقام ہے۔ جدید جاہلیت نے عالم گیر سطح پر جو فاسد طرز فکر پیدا کیا ہے اس میں مارکس کے بیان کیے ہوئے فلسفۂ تاریخ کا بھی بڑا دخل ہے۔ مارکس کے نظریے کا حاصل یہ ہے کہ انسانی افکار، تہذیب، تمدن، سیاست، علم وادب اور مذہب واخلاق میں سے کوئی چیز اپنی ذاتی حقیقت نہیں رکھتے۔ ان کی اصل حقیقت انسانی تاریخ صرف اور صرف معاشی وسائل کے لیے جنگ و پیکار کی تاریخ ہے۔ معاشی وسائل کے لیے ہونے والی یہی جنگ و پیکار ہر دور کی زندگی اور اس کے تمام افکار اور نظامہائے حیات کو پیدا کرتی اور چلاتی ہے۔ دنیا میں نہ کوئی ابدی صداقت ہے، نہ مذہب واخلاق کی حتمی بنیادیں۔ جو ہے وہ صرف معاشی وسائل کی لڑائی ہے جو معاشی وسائل پر قابض طبقوں اور ان سے محروم طبقوں کے درمیان جاری رہتی ہے۔ مذہب، قانون، نظام سیاست، تمدن، طرز زندگی افکار وفنون اور تہذیب وغیرہ، یہ وہ چولے ہیں جو اس لڑائی کے فریق مختلف موقعوں پر اپنی مصلحتوں کے مطابق ایجاد کرتے، پہنتے اور اتارتے رہتے ہیں۔ اس کو اپنے فلسفے کی اس بنیاد پر شدید اصرار ہے، اور اس کا اور اس کے متبعین کا یہ اعلان ہے کہ اس بنیاد کو مانے بغیر دنیا سے معاشی ظلم ختم نہیں ہوسکتا، اور نہ تاریخ انسانی اپنے کمال کے مقام کو پہنچ سکتی ہے۔

مارکس کا خیال ہے کہ دنیا میں اصل حقیقت صرف معاشی مسائل کی ہے۔ انسانی تاریخ از اول تا آخر معاشی مسئلے کے گرد گردش کرتی ہے۔ یہاں مذہب واخلاق اور روح وغیرہ جیسے تصورات سراسر نقلی اور افسانوی ہیں۔

بائیوگرافی:

اس نے اپنے نظریے کی بنیاد مشہور جرمن روحانی فلسفی ہیگل کے ''تصور اضداد'' اور جدلیت (Dialect) کو بنایا۔ ہیگل (Hegel) کا خیال تھا کہ کائنات کی اصل ایک روحانی حقیقت ہے جسے وہ روح کائنات (World Sprit) یا عقل مطلق (Absolute Idea) جیسے نام دیا کرتا ہے۔ یہ روح کائنات دراصل اپنی تکمیل میں مصروف ہے، اشیاء اصل میں تصورات ہیں۔ ہر تاریخی دور دراصل ایک خاص تصور کا مظہر ہوتا ہے۔ اس دور کی ہر چیز اسی تصور کی مظہر ہوتی ہے۔ اس دور کا نظام زندگی، مذہب اور تہذیب اسی تصور کی نمود ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ تصور اپنی آخری انتہا کو پہنچتا ہے اور اس پر قائم افکار وخیالات، نظام زندگی اور مذہب وتمدن سب کے سب اپنے ممکنہ کمال تک پہنچ جاتے ہیں۔

اس مرحلے پر اس دور کے طبعی تقاضوں سے اس تصور کی ضد تصور پیدا ہوتا ہے۔ ہیگل پہلے کو Thesis اور دوسرے کو Anti Thesis کہتا ہے۔ اور دونوں میں کشمکش ہوتی ہے۔ ایک عرصے کی اس کشمکش کے نتیجے میں دونوں کے امتزاج سے ایک تیسرا تصور پیدا ہوتا ہے جو دونوں کی خوبیوں پر مشتمل ہوتا اور ماضی کے تصور سے کامل تر اور بہتر ہوتا ہے۔ وہ اس کا نام Synthesis رکھتا ہے۔ اس دور کی ہر چیز اسی کے مطابق بلکہ اسی کی مظہر ہوتی ہے۔ اس طرح قدیم وجدید کے امتزاج سے ایک نیا دور اپنی نئی تہذیب ونظام زندگی کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔

پھر اس تصور کی بھی ضد ہوتی ہے اور دونوں کی کشمکش سے نیا تصور اور نیا دور پیدا ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ یونہی جاری ہے، یہاں تک کہ مذاہب وافکار اور تہذیب واخلاق کی صورتوں میں جاری یہ ارتقا اپنی آخری منزل میں پہنچ جائے گا، اور اس وقت اس کو عالم گیر تصور (Universal Idea) کہا جائے گا۔

ہیگل نے اپنے اس فکر کو جدلی منطق (Dialectical Logic) کا نام دیا، وہ کہتا ہے کہ پہلے لوگ منطق (Formal Logic) کی رو سے صغریٰ اور کبریٰ کو مستقل مانتے تھے اور ان سے نکلے نتائج کو مستقل صداقت سمجھتے تھے۔ اس نے جو منطقی نظام طے کیا ہے اس کی رو سے نہ کوئی سچائی ابدی ہے نہ کوئی حقیقت مطلق۔ ہر دور کی الگ سچائیاں اور حقیقتیں ہیں۔ دوسری جو چیز اس کی فکر کا لازمی نتیجہ ہے وہ یہ کہ تاریخ کا ہر اگلا دور اور ہر اگلا نظام وتہذیب پہلے سے مکمل تر اور ترقی یافتہ ہے۔

مارکس میں ہیگل سی ذہنی لطافت نہ تھی، وہ کسی روحانی وجود وغیرہ کا قائل نہ ہو سکا، اس نے اس سے جدلیت اور اضداد کی کشمکش کا تصور تو لے لیے، مگر اس نے کسی روح مطلق یا تصورات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کے نزدیک انسانی زندگی کے انقلابات اور اس کے بدلتے ہوئے نظامہائے زندگی، یا اس کے مذاہب واخلاقیات، یا قوانین ورسوم کی اصل اس کا معاشی مسئلہ اور روٹی کی جنگ ہے۔ اس نے اپنے فکر کی ابتدا کسی غیر مادی تصور یا روح کے انکار سے کی۔ اس کا کہنا ہے کہ انسان کا اصل مسئلہ معاشی وسائل اور ان کی تقسیم کا ہے۔ وہی انسان کی ہر چیز کو پیدا کرتا اور ختم کرتا ہے۔ انسانی تہذیب اور تاریخی انقلابات کی اصل معاشی وسائل کی کشمکش ہے۔

اس کا کہنا ہے کہ ہر دور میں معاشی وسائل اور اسباب زندگی کی تیاری اور تقسیم پر کچھ طبقات قابض ہوتے ہیں، اور کچھ ان سے محروم اور پہلے طبقے کے دست نگر ہوتے ہیں۔ محروم طبقات معاشی وسائل پر قبضے کے لیے کوشش کرتے اور قابض طبقات سے جنگ کرتے ہیں اور وسائل کی تقسیم کے ایک ایسے نظام کا مطالبہ کرتے ہیں جس میں ان کو بہتر حصہ ملے۔ اس دور میں قابض طبقات اپنے مفادات کے لحاظ سے سیاسی معاشی تمدنی افکار وقوانین اور تہذیب پیدا کرتے ہیں۔ اس دور کا مذہب بھی ان ہی کا خادم ومحافظ ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ محروم طبقے مجبور ہوتے ہیں کہ وہ ماضی کے اُن قانونی، مذہبی اور اجتماعی افکار کے اُس پرانے مجموعے کو رد کر دیں اور اپنی جدوجہد کے لیے ایسے نئے قانونی، مذہبی اور اخلاقی افکار کا مجموعہ تیار کریں جو ان کی جدوجہد کے لیے مددگار اور ان کو معاشی وسائل پر قبضہ دلانے میں معاون ہو۔ یہ دراصل پرانے نظام کا (Anti Thesis) ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کشمکش سے ایک نیا معاشی نظام پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ اس دور کی ہر چیز بدل جاتی ہے۔

اس کے بعد مارکس کا تخیل کہتا ہے کہ تاریخ اسی کشمکش اضداد اور روٹی پر قبضے کی جنگ کے ذریعے ایک ''عالمی اشتراکی انقلاب'' تک بڑھ رہی ہے جس کے ذریعے وسائل معیشت پر تمام انسانوں کی مشترکہ ملکیت قائم ہو جائے گی اور مزدوروں کی حکومت قائم ہو جائے گی۔

مارکسی خیالی دنیا کی اس پیشینگوئی پر ہم کوئی بحث نہیں کرتے، خصوصاً اس لیے کہ مارکسیت ایک معاشی نظام یا ٹھیٹھ انقلابی تحریک کے اب نہایت کمزور ہو چکی ہے۔ لیکن اس کی عظمت انسانی فلسفۂ وفکر کے ایوان میں آج بھی مسلم ہے۔ اور مغربی فکر وتہذیب میں انسان اور انسانی تاریخ کی معرفت میں مارکس کو امامت کا اعلیٰ مقام دیا جاتا ہے۔ اس لیے ہم یہاں اس پورے فلسفۂ تاریخ پر اس اعتبار سے ضرور نظر ڈالنا چاہتے ہیں کہ یہ تصور کس قدر پست وحقیر اور فساد آدمیت کا سبب ہے۔

اس فلسفے کے لحاظ سے ہر دور کے افکار وتصورات اور تہذیب وطرز زندگی سے لے کر اخلاق واعمال تک میں خیر وشر اچھے برے اور صحیح وغلط کی تلاش وہم پرستی اور دھوکہ ہے۔ ہر دور کی تمام چیزیں اپنے زمانے کی معاشی صورت حال کی پیداوار ہوتی ہے۔ پیداوار کا نظام اور ان کی تقسیم کی ترتیب ایک دور کی تمام اشیاء اور بین انسانی تعلقات کے نظام کو پیدا کرتی ہے۔ اسی سے اس دور کا مذہب پیدا ہوتا ہے، اسی سے قوانین اور تہذیب پیدا ہوتے ہیں اور اسی سے اخلاقی ومذہبی تصورات کا وجود ہوتا ہے۔ انسان خیر وشر اور روحانیت وشرافت جیسی جن چیزوں کا عاشق ہوتا آیا ہے، یا انصاف اور محبت نامی جن چیزوں کو پسند کرتا آیا ہے، ان میں حقیقت کا ذرہ بھی نہیں۔ یہ سب دراصل طمع ولالچ کے بازیگر کے وہ دھوکے ہیں، جن سے وہ اپنے مقاصد کے لیے انسانی طبقات کو مصروف عمل رکھتا ہے، اور ان ڈھکوسلوں کے ذریعے معاشی وسائل پر قبضے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔

جن لوگوں کو اس فلسفے نے متأثر کیا ہے ان کے نزدیک ماضی کا کوئی مذہبی یا فکری نظام بعد کے کسی دور میں قابل تقلید تو کیا لائق اعتنا ہی نہیں ہو سکتا۔

اس کی حقیقت تو بس یہ ٹھیری کہ وہ آج سے سیکڑوں سال پہلے اپنے زمانے کے معاشی وسائل کی پیداوار اور ان کی تقسیم کے نظام کا نتیجہ تھا۔ جو لوگ اس دور میں معاشی وسائل پر قابض تھے اور جو محروم طبقات تھے ان دونوں میں ایک کشمکش برپا تھی، قدیم افکار و قوانین، رائج الوقت مذہب و اخلاقی نظام اور سماجی تعلقات کا سسٹم جیسی اس دور کی تمام اشیاء قابض طبقات اور ان کے معاشی نظام کی حمایت کے لیے موجود ہوتے ہیں، اور پوری کوشش کرتے ہیں کہ قابض طبقات کا قبضہ برقرار رہے۔ اس لیے محروم طبقات کو اپنی جدوجہد کے لیے نئے افکار و قوانین، جدید مذہب اور اخلاقی نظام ایجاد کرنا پڑتا ہے۔ گویا ان تمام اشیاء میں اصل تو بس معاشی تونگری کا حصول اور استحصال ہے، باقی صرف وہم و فریب ہے یا ڈھکوسلہ اور بہروپ۔

جو لوگ اس فلسفے پر ایمان لانے والے ہوں گے ان میں سوائے مفاد پرستی ابن الوقتی، لالچ، اور مال پرستی کے کسی اور چیز کی توقع رکھی جائے۔ بلکہ اگر اس فکر کو کسی درجے میں بھی قابل غور اور امکان سے قریب مانا جائے گا تو کیا انسانیت کو کبھی خدا پرستی و روحانیت تو دور کی بات ہے کبھی شرافت، اصول پسندی، انصاف، ایثار، خیر پسندی، اور عفت و امانت کا بھی درس دیا جاسکے گا؟